سیّدمحمدحسنین اورڈاکٹر ذاکرحسین

مرتبہ: رفیع الدین ہاشمی

سیّدمحمدحسنین (۲۳مارچ۱۹۱۷ء- ۱۴جنوری ۲۰۰۵ء) اکتوبر۱۹۴۱ء سے جماعت اسلامی ہند سے وابستہ ہوئے اور تادمِ مرگ یہ وابستگی قائم رہی بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ پختہ تر ہوتی گئی۔ اس دوران انھوں نے مختلف جماعتی ذمہ داریاں ادا کیں۔ مشرقی ہند کے قیم، شمالی بہار کے امیر حلقہ اور کُل ہند جماعت مجلس شوریٰ کے رکن رہے۔ مزید برآں درس گاہِ اسلامی دربھنگا کے ناظم بھی رہے۔ جماعت اسلامی سے وابستگی کے سبب کئی بار پابندِ سلاسل بھی ہوئے۔ بقول اے یو آصف: ''ان کی پوری زندگی جماعت کے کاز کے لیے وقف تھی''۔ (دعوت دہلی، ۷مارچ ۲۰۰۵ء)

ان کا آبائی تعلق صوبہ بہار (کورونی، بھپوڑا، دربھنگا) سے تھا۔ ابتدائی تعلیم سوری ہائی اسکول مدھوبنی سے حاصل کی۔ حصولِ علم کا شوق انھیں کشاں کشاں دہلی لے آیا۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں گھر والوں کو بتائے بغیر پڑھنے کے لیے آئے تھے۔ شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی توجہ سے محمدحسنین کو اگست ۱۹۳۴ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ثانوی سوم میں داخلہ مل گیا۔ مئی ۱۹۴۰ء میں جامعہ سے بی اے کیا۔ زمانۂ طالب علمی میں وہ ہمیشہ ہر کلاس میں اوّل رہے۔ مزید برآں جامعہ کالج کے طلبہ کی تنظیم انجمن اتحاد کے ناظم اور انجمن اتحاد کے ترجمان قلمی رسالے کے اڈیٹر بھی رہے۔ علامہ اقبال پر رسالے کا خاص نمبر جوہرِ اقبال کے نام سے شائع ہوا۔ جامعہ میں اُن کا قیام بورڈنگ ہاؤس (اقبال ہال) میں تھا۔ وہ اس ہاؤس کے سینئر مانیٹر تھے۔ روایت ہے کہ مولانا سیّدابوالاعلیٰ مودودیؒ کسی موقعے پر جامعہ ملیہ گئے تو سیّدمحمدحسنین کے کمرے میں بھی تشریف لے گئے۔

ڈاکٹر ذاکرحسین سے طالب علمی کے زمانے میں حسنین صاحب کا جو تعلق قائم ہوا، اسے اوّل الذکر نے ٹوٹنے نہیں دیا، عمر بھر قائم رکھا اور آفرین ہے مؤخر الذکر پر کہ انھوں نے (باوجود گورنر صوبہ بہار اور صدر جمہوریہ ہند ہوجانے کے) حسنین صاحب کو یاد رکھا، بھلایا نہیں۔ ذاکر صاحب فوت ہوئے تو حسنین صاحب نے حسب ذیل مضمون میں ذاکر صاحبؒ سے اپنے تعلق کی ابتدا اور ان تعلقات میں نشیب وفراز کی تفصیل

قلم بند کی۔ یہ مضمون پٹنہ کے خدا بخش لائبریری جرنل میں شائع ہوا تھا۔

اس مضمون سے جہاں خود حسنین صاحب کے مزاج اور ان کی شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے، خصوصاً ان کی دعوتی سرگرمیوں اور دعوتِ دین کے طریق کار کا پتا چلتا ہے، وہیں ڈاکٹر ذاکر حسین کی دل نواز مگر مصلحت پسند شخصیت کی جھلکیاں بھی سامنے آتی ہیں۔ وہ جماعت اسلامی کی دعوت کو سمجھتے تھے اور کانگریسی ہونے کے باوجود جماعت کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے جیسا کہ زیرِ نظر مضمون سے اندازہ ہوتا ہے۔ (مرتب)

وہ ایک مردِ قلندر تھے —— مروّت حسن عالم گیر تھا، استاد ذاکر کا ——

● **پہلی ملاقات**: استاد ذاکر حسین رحمۃ اللہ سے میری تین یادگار ملاقاتوں میں سے پہلی ملاقات؛ اگست ۱۹۳۴ء میں ہوئی۔ جب میں داخلے کے لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی پہنچا تو داخلے کے آخری مرحلے پر مجھ کو استاد رحمۃ اللہ کی خدمت میں پیش کیا گیا کہ وہ میرے داخلے کے فارم پر دستخط کر دیں۔ انھوں نے تعارف کے لیے میرے حالات دریافت کیے۔ میں ایک خط لکھ کر لے گیا تھا؛ جس میں مَیں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخلہ لینے کی غرض بتائی تھی اور یہ عرض کیا تھا کہ میں اپنی والد کی مرضی کے خلاف اپنے تعلیمی سلسلے کو چھوڑ کر جامعہ ملیہ اسلامیہ اس لیے آیا ہوں کہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ یہاں اسلامی اور دنیوی دونوں طرح کی تعلیم ساتھ ساتھ دی جاتی ہے۔ مدھونی بہار کے جس اسکول میں، مَیں تعلیم حاصل کر رہا تھا، اس میں اسلامی تعلیم کا کوئی موقع نہیں تھا اور میرے والد صاحب کا حوصلہ یہ تھا کہ وہ مجھ کو وکیل بنائیں اور مجھے وکیل بننے سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ دوسری بات یہ کہ میں چاہتا ہوں کہ جب میں اپنے والد کی مرضی کے خلاف اپنے تعلیمی سلسلے کو چھوڑ کر جامعہ میں تعلیم حاصل کرنے آیا ہوں، تو ان پر اپنی تعلیم کے مصارف کا بار نہ ڈالوں اور آپ سے یہ درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ اگر میرا داخلہ جامعہ میں ہو جائے تو تعلیمی اوقات کے علاوہ کسی وقت جامعہ کی کوئی خدمت مجھ سے لیں اور اس کے عوض اتنا معاوضہ دیں جس میں کسی طرح یہاں کا خرچ نکال سکوں۔ میرے خط کو پڑھ کر وہ خاموش رہے اور فارم پر دستخط کرنے سے پہلے فرمایا: ''میں آپ سے ایک عہد لینا چاہتا ہوں''۔ میں نے عرض کیا: وہ کیا؟ فرمایا: ''عہد کیجیے کہ میں ہمیشہ سچ بولنے کی کوشش کروں گا''۔ میں نے عرض کیا: ''الحمدللہ، میں شعوری طور پر پہلے سے اس پر عامل ہوں''۔ انھوں نے میرے فارم پر دستخط کر دیے۔

[اے یو آصف راوی ہیں کہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے ان کے شوقِ تعلیم اور جستجو کو دیکھ کر داخلے کی منظوری تو دے دی لیکن وطن واپس جا کر والد سے اجازت لے کر آنے کا کہا۔ ان کے حکم کے مطابق وہ واپس آگئے اور پھر اجازت حاصل کی۔]

ہاں، یہ بتا دوں کہ جب میں ان کے کمرے میں داخل ہوا تو ایک نہایت حسین و وجیہ پُروقار شخصیت سے سامنا ہوا تھا۔ اس وقت ان کی عمر ۳۵-۴۰ کے قریب رہی ہوگی۔ سرخ، سفید چہرہ اور اس پر بھرپور سیاہ داڑھی، بقول حفیظ جالندھری بع جلال بھی ہے جمال بھی ہے، یہ شخصیت کا کمال بھی ہے۔

انھوں نے ہنستے ہوئے گرمجوشی سے میرا استقبال کیا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ وہ ایک نہایت سفید فرش پر بیٹھے تھے۔ فرش کے اوپر ناریل کی چٹائی تھی۔ سامنے فرشی میز تھی جس پر ہر چیز اپنی جگہ انتہائی سلیقے سے سجی ہوئی رکھی تھی۔ ان کی بائیں طرف دیوار پر شیشے کا ایک فریم آویزاں تھا جس پر یہ شعر خوش خطی کا بہترین نمونہ پیش کر رہا تھا ؎

آسایش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
بادوستاں تلطف ، بادشمناں مدارا

جب انھوں نے میرے فارم پر دستخط کر دیے تو ان سے الوداعی مصافحہ کر کے کمرے سے باہر آیا اور بہت خوش اور مسرور تھا۔

چند دنوں کے بعد جامعہ کے احاطے میں ان سے آمنا سامنا ہوا۔ انھوں نے مجھے روک کر فرمایا: ''تعلیم ختم ہو جانے کے بعد دو گھنٹے صدر مدرس کے دفتر میں آپ کام کیا کریں گے۔ اس کے عوض آپ کو ۸ روپے ماہانہ ملا کریں گے جس سے آپ اپنا جامعہ کا خرچ پورا کرنے کی کوشش کریں''۔ اس پر میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

میں نے اپنا داخلہ جامعہ میں غیر مقیم طالب علم (Day Scholar) کی حیثیت سے کرایا، کیوں کہ اس وقت جامعہ میں دارالاقامہ میں قیام و طعام کے مصارف ۱۶ روپے ماہانہ تھے۔ اس وقت مَیں جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی سے اُتر کی جانب سبزی منڈی کے ریلوے اسٹیشن کے احاطے میں ایک مسجد میں رہتا تھا جس کی دوری جامعہ قرول باغ سے دو (۲) میل سے کم نہ تھی۔ ایک روز پھر جامعہ میں میرا اُن سے آمنا سامنا ہوا اور یہ پوچھا کہ ''آپ کہاں رہتے ہیں؟'' میں نے بتایا کہ

سبزی منڈی، ریلوے اسٹیشن کی مسجد میں۔ یہ سن کر خاموش ہوگئے۔ چند دنوں کے بعد پھر اسی طرح سرِراہ ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے فرمایا: ’’قرول باغ میں جامعہ سے متصل ہی ان کے عزیز، احمد خاں رہتے ہیں، جو طبیہ کالج میں پڑھتے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا ہے، ان کے کمرے میں گنجایش ہے، آپ ان کے ساتھ رہ سکتے ہیں‘‘۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور چند دنوں میں سبزی منڈی سے قرول باغ منتقل ہوگیا۔ احمد خاں صاحب نے اپنے کمرے میں جگہ دی لیکن کرایہ قبول نہ کیا۔

ایک سال تک ان کے ساتھ رہا۔ نہایت مخلص اور شریف آدمی ثابت ہوئے۔ ۸ روپے جامعہ سے جو بطور معاوضہ کے ملتے تھے، اس میں سوا دو روپے میں نے جامعہ کی فیس تعلیم ادا کی اور چار روپے میں جامعہ کے مطبخ سے دو نمبر کھانا جاری کرالیا جس میں صرف دال اور چپاتیاں ملا کرتی تھیں۔ باقی پونے دو روپے ناشتہ اور اوپر کے خرچ کے لیے کافی ہوجایا کرتے تھے۔ کچھ دنوں بعد پھر ایک روز جامعہ میں سرِ راہ ملاقات ہوئی تو استاد علیہ الرحمہ نے مجھے روک کر فرمایا: ’’ڈاکٹر سلیم الزماں صاحب کے چھوٹے بچے کو شام کو ایک گھنٹہ ان کی کوٹھی پر جاکر پڑھا دیا کریں۔ دس روپے ماہانہ معاوضے کے طور پر وہ دیا کریں گے‘‘۔ اس طرح جامعہ میں یہ سہولت تعلیم حاصل کرنے کا موقع میرے لیے پیدا کرادیا اور جب تک جامعہ میں قیام رہا، ان کی نوازشوں اور کرم فرمائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔

ان ساری نوازشوں کا تذکرہ اس وقت نامناسب ہے لیکن ایک واقعے کا تذکرہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک روز جامعہ لائبریری کے برآمدے میں اسٹینڈ پر جہاں روزنامہ اخبار لگے رہتے تھے، لوگ کھڑے ہوکر اخبار پڑھ رہے تھے، میں بھی اخبار دیکھ رہا تھا۔ بائیں طرف کے راستے سے استاد علیہ الرحمہ گزر رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں اٹھائیں تو ان سے آنکھیں چار ہوئیں اور بغیر ان کو سلام کیے میں دوبارہ اخبار پڑھنے میں مشغول ہوگیا۔ استاد علیہ الرحمہ چلتے چلتے رُک گئے اور پھر جب میں نے نظر اُٹھا کر ان کو دیکھا تو انھوں نے جھک کر مجھ کو فرشی سلام کیا اور آگے بڑھ گئے۔ میں نے جواب تو دیا لیکن سلام نہ کرنے کی کوتاہی پر بڑی ندامت محسوس کی ـــــ یہ تھا ان کا ایک اندازِ تربیت!

● **دوسری ملاقات کا تاثر:** ۱۹۴۰ء میں جامعہ ملیہ سے فارغ ہو کر میں دربھنگا آ گیا۔ [اے یو آصف لکھتے ہیں: '' ۱۹۴۰ء میں مرحوم سید صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ سے تعلیم کی فراغت کے بعد، رخصت ہوتے وقت جب ذاکر حسین سے ملنے گئے تو انھوں نے ان سے برجستہ کہا: تمھارے لیے تو لائبریری میں ذمہ دار کا عہدہ میرے ذہن میں ہے۔ تم کہاں جا رہے ہو؟ یہیں رہو تا کہ ہم سب مل کر جامعہ کی خدمت کریں۔ اس پر حسنین سید کہنے لگے: استاد محترم، آپ نے جو تعلیم و تربیت دی ہے، اس کا تقاضا ہے کہ میں پوری زندگی اسلام کے کاز میں لگا دوں، لہٰذا معذرت خواہ ہوں اور دربھنگا واپس جا رہا ہوں''۔]

۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کی تشکیل عمل میں آئی اور میں اس سے وابستہ ہو گیا۔ جماعت اسلامی کا مرکز لاہور سے پٹھان کوٹ منتقل ہو گیا۔ ۱۹۴۴ء میں آل انڈیا جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ میں رکن بنایا گیا۔ مجلس شوریٰ میں شرکت کے لیے پٹھان کوٹ آتے جاتے میں دہلی میں رک کر احباب سے ملاقات اور اپنے اساتذۂ کرام کی خدمت میں حاضری دیا کرتا تھا۔ استاد علیہ الرحمہ جب علی گڑھ کے وائس چانسلر ہوئے تب بھی دہلی آتے جاتے، ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ جماعت کا لٹریچر ان کی خدمت میں پیش کرتا اور جماعت کی سرگرمیوں سے ان کو واقف کراتا تھا۔ وہ ہمیشہ بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے تا آنکہ وہ ۱۹۵۷ء میں بہار کے گورنر ہو کے پٹنہ تشریف لائے۔ ان کا گورنری کا عہدہ قبول کرنا مجھ کو پسند نہ آیا۔ میرے خیال میں یہ منصب ان کے مقام سے بہت فروتر تھا۔ نہ میں اُن سے ملنے گیا اور نہ ان کی خدمت میں خیر مقدم کا کوئی خط ارسال کیا۔ تقریباً چھے مہینے کے بعد انھوں نے پٹنہ کے کسی صاحب سے میرے متعلق تذکرہ کیا کہ ''یہاں بہار میں میرے ایک شاگرد ہیں حسنین۔ وہ اب تک ملاقات کے لیے نہیں آئے، پتا نہیں کیا بات ہے۔ کبھی کبھی وہ میرا ایمان تازہ کر دیا کرتے تھے''۔ ان صاحب نے پٹنہ میں مجی شبیر احمد (جو ان دنوں پٹنہ میں ایک سوڈا فیکٹری کے منیجر تھے) سے میرے بارے میں استاد علیہ الرحمہ کی گفتگو دہرائی۔ ایمان تازہ کرنے کی بات یہ ہے کہ جب میں ان کی خدمت میں حاضری دیا کرتا تھا تو جماعت کی کوئی نہ کوئی کتاب ان کی خدمت میں پیش کیا کرتا تھا۔ مجی بشیر احمد صاحب نے مجھ کو پٹنہ سے ایک کارڈ لکھا کہ تم اب تک اپنے استاد سے کیوں نہیں مل سکے اور استاد علیہ الرحمہ کی گفتگو نقل کی۔ اُن کا خط ملنے پر

میں نے استادؒ کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا، بعد القاب و آداب میں نے عرض کیا تھا:

''گورنر کی حیثیت سے آپ کو پٹنہ تشریف لائے ہوئے کافی دن ہو گئے، لیکن افسوس ہے کہ میں نہ تو آپ کی خدمت میں حاضر ہو سکا اور نہ خیر مقدم کا کوئی خط ہی ارسال کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اس الجھن میں ہوں کہ آپ کے لیے گورنری، قلندری سے کیسے افضل ہو گئی؟ اور آپ نے اسے کیسے پسند فرما لیا؟ اخبارات میں یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ آپ اس ریاست کو نمونے کی ریاست دیکھنا چاہتے ہیں لیکن جس کے کار پردازوں کا طرزِ عمل ظلم و جور کا ہو، اس کو نمونے کی ریاست بنانے میں آپ کو بہت دشواری پیش آئے گی۔ جماعتِ اسلامی ہند سے تو آپ بہت حد تک واقف ہیں۔ جماعت اسلامی کے سلسلے میں حکومتِ بہار کا جو رویہ ہے، اس کے متعلق دعوت، اخبار میں میرا ایک بیان شائع ہوا ہے۔ اس کا تراشا ارسالِ خدمت ہے''۔ (ان دنوں حکومتِ بہار نے جماعت اسلامی پر subversive activities [تخریبی سرگرمیوں] کا الزام لگایا تھا اور ملازمین کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ لوگ جماعت کی سرگرمیوں سے دور رہیں ورنہ Conduct Rule دفعہ ۳۳ کے تحت ان کے خلاف کارروائی کی جائے گی)۔ دوسری بات میں نے یہ عرض کی تھی کہ ''اب مجھ جیسا معمولی آدمی آپ کی خدمت میں حاضر ہونا بھی چاہے تو کیسے حاضر ہو سکتا ہے؟ اور جماعت کا کچھ تازہ لٹریچر بھی خط کے ساتھ رجسٹرڈ ڈاک سے استاد علیہ الرحمہ کی خدمت میں ارسال کر دیا لیکن پندرہ دنوں تک ان کی طرف سے نہ کوئی جوب آیا اور نہ خط کی رسید ہی ملی۔ اس پر میں نے ڈاک سے دوسرا عریضہ ان کی خدمت میں ارسال کیا اور اس میں عرض کیا کہ دو ہفتوں سے زائد ہو گئے آپ کی خدمت میں ایک عریضہ اور اور چند کتابیں ارسال کی تھیں۔ تعجب ہے کہ اس کے جواب میں نہ تو آپ کا کوئی گرامی نامہ ملا اور نہ خط کی رسید ہی ملی۔ اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں آپ تک نہیں پہنچ سکیں ورنہ آپ سے ایسی توقع نہیں ہے کہ آپ میرے عریضے کا جواب نہ دیں گے۔ میرے اس عریضے کے جواب میں رانچی سے ان کا گرامی نامہ ملا۔ اس خط کا مضمون یہ ہے:

راج بھون- رانچی کیمپ، ۱۰ ستمبر ۱۹۵۷ء

عزیزم حسنین صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

آپ کے دونوں محبت نامے ملے۔ آپ کا بھیجا ہوا لٹریچر بھی ملا۔ معافی چاہتا ہوں کہ پہلے

خط کے جواب میں اتنی دیر ہوئی کہ آپ کو یاد دہانی کرنی پڑی۔ شاید آپ کو غلط فہمی ہو، اس لیے وجہ لکھے دیتا ہوں۔ میں ذاتی خطوط کے جواب لکھنے میں بہت کاہل ہوں۔ پھر اگر کوئی دوست یا عزیز اپنے خط میں کوئی ایسا سوال کر دیتا ہے، جو میری شخصی داخلی زندگی سے متعلق ہو تو مجھے اس کا جواب لکھنا اور دشوار ہو جاتا ہے۔ آپ نے اپنے پہلے خط میں الجھن یہ بتائی کہ قلندری سے گورنری کیسے اور کب سے افضل ہوگئی اور میں نے گورنری کو قلندری پر کیسے ترجیح دی؟

پہلے تو عزیزِ من ! میں قلندر کب تھا؟ لیکن سوال کو اپنی ذات سے الگ کر کے ایک اصولی سوال سمجھوں تو اس کا بہت اچھا جواب حضرت مخدوم سیّد علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ المعروف داتا گنج بخش نے اپنی کتاب کشف المحجوب میں ایک جگہ دیا ہے___ اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھتا:

[وہ فرماتے ہیں]: استاد ابوالقاسم قشیری رحمۃ اللہ علیہ سے ہم نے سنا، فرمایا: فقیری اور مال داری کے سلسلے میں لوگوں نے بات کہی ہے اور اس کو اختیار کیا ہے، میں اس کو اختیار کرتا ہوں جو اللہ تعالیٰ میرے لیے پسند فرمائے اور مجھ کو اپنی نگاہ میں رکھے۔ اگر مال داری کی حالت میں رہوں تو اللہ سے غافل نہ ہونے پاؤں اور اگر غربت کی حالت میں رہوں تو حریص اور لالچی نہ بنوں۔ لہٰذا مال داری نعمت ہے اور اس حال میں اللہ سے غفلت آفت ہے۔ غریبی اور فقیری بھی نعمت ہے اور اس حال میں حرص آفت ہے۔

دوسری الجھن کا جواب سہل ہے۔ میں ابھی کوئی تین چار ہفتہ یہاں ہوں۔ وسط اکتوبر سے ان شاء اللہ پٹنہ میں رہوں گا۔ آپ ایک کارڈ میرے سیکرٹری کو لکھ دیں، وہ مجھ سے پوچھ کر آپ کے لیے وقت مقرر کر دیں گے۔ ضرور تشریف لائیے۔ مفصل گفتگو کو بہت جی چاہتا ہے۔ خدا کرے کہ آپ خیریت سے ہوں اور خوش بھی۔ خیر طلب: ذاکر حسین

میں نے استادؒ کی ہدایت کے مطابق ان کے سیکرٹری کو خط لکھا اور ان سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ انھوں نے وقت مقرر کر کے مجھ کو مطلع کیا۔ مقررہ وقت پر میں راج بھون پہنچا۔ ان کے ملٹری سیکرٹری نے میرا استقبال کیا اور ان کے کمرے تک میری رہ نمائی کی۔ میں کمرے کے اندر داخل ہو گیا تو انھوں نے دروازہ بند کر دیا۔ استادؒ کو میں نے سلام کیا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ انھوں نے کھڑے ہو کر معانقے کے لیے کھینچ لیا اور اسی حال میں ہنستے ہوئے فرمایا:

''آپ لوگ حکومت پر بہت تنقید کرتے ہیں''۔ پھر اپنے قریب کی کرسی پر بیٹھنے کی ہدایت کی۔

میں نے جواب میں عرض کیا: ''جب ہم مجبور ہوتے ہیں تبھی حکومت پر تنقید کرتے ہیں''۔

اس کے بعد دوسرا سوال انھوں نے یہ کیا: ''کیا ابھی مولانا ابواللیث صاحب امیر جماعت اسلامی ہند نے کہیں یہ کہا ہے کہ ''جماعت اسلامی پاکستان نہیں چاہتی تھی؟'' میں نے عرض کیا: ''کہا ہوگا۔ جماعت اسلامی تو پوری دنیا میں اللہ کی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے، لیکن کچھ لوگوں نے ہندستان کے دوٹکڑوں پر ہی قناعت کرلی ہے''۔

انھوں نے فرمایا کہ ''حسنین صاحب! آپ لوگ حکومت الٰہیہ قائم کرنا چاہتے ہیں لیکن عام طور سے ہندستان کے مسلمان حکومتِ الٰہیہ نہیں چاہتے ہیں''۔ میں نے ان سے کہا: یہ کم حوصلگی اور پست ہمتی ہے ورنہ مسلمان کی حیثیت سے: ''ہر ملک، ملکِ ماست کہ ملکِ خداماست''۔ ہر ملک میں حکومت الٰہیہ یا اللہ کا دین قائم ہونا چاہیے''۔ اس کے بعد میں نے عرض کیا: ''آپ کی حکومت نے جماعت اسلامی کو subversive [تخریبی] کیسے قرار دے دیا، ہم لوگ تو پُرامن طریقے پر لوگوں کو اللہ کے راستے پر بلاتے ہیں، کوئی توڑ پھوڑ، قتل وغارت گری کا طریقہ نہیں اپناتے ہیں''۔ انھوں نے فرمایا: ''subversive ہونے کے لیے اتنا کافی ہوسکتا ہے کہ حکومت کے دستور کو تسلیم نہ کیا جائے اور غیر پارلیمانی طریقے سے حکومت کو تبدیل کرنے کی کوشش کی جائے۔ دیکھیے! کمیونسٹوں نے ملک کے دستور کو مان کر کیرالا میں الیکشن میں حصّہ لیا اور الیکشن میں کامیاب ہونے پر وہاں حکومت بنائی۔ آپ لوگ بھی دستور کو مان کر پارلیمانی طریقے سے حکومت کو بدل سکتے ہیں''۔ میں نے عرض کیا کہ اگر subversive سے یہ مطلب ہے تو ہم اقراری مجرم ہیں۔ یہ فرمایئے کہ کیا ہم آپ کی ریاست میں اللہ کا نام لے سکتے ہیں؟ انھوں نے فرمایا کہ اس سے آپ کو کون روک سکتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ جب ہم لاالٰہ الا اللہ کی تشریح کریں گے تو پھر subversive آجائے گا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ ایک چیز پھل ہے اور ایک چیز درخت ہے۔ پھل سے اگر لوگوں کو اختلاف ہے، قبل از وقت پھل کا تذکرہ مت کیجیے۔ درخت لگانے کی کوشش کیجیے۔ جب لوگ آپ کے میٹھے پھل کو چکھیں گے تو مخالفت ترک کردیں گے۔ میں نے بہ ادب عرض کیا: درخت لگانے کا عمل چپکے سے اور اکیلے تو نہیں ہوگا، اس کی خوبیوں کو بتا کر کچھ لوگوں کو تو اپنے

ساتھ لینا ہی ہوگا اور ان کے تعاون ہی سے یہ کام انجام پا سکتا ہے۔ میں نے جماعت اسلامی کی دعوت اور طریقۂ کار کا مختصراً تعارف کرایا۔ آپ نے توجہ اور صبر سے میری باتوں کو سنا اور فرمایا: ''ٹھیک ہے جس بات کو آدمی حق سمجھے، اس کے لیے جدوجہد کرے''۔ اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ ''آپ کی حکومت میری ہمہ وقت نگرانی کیوں کرتی ہے؟ سی آئی ڈی کے دو آدمی سایے کی طرح میرے ساتھ رہتے ہیں؟'' جواب میں انھوں نے فرمایا: ''یہ آپ کے لیے ہی مخصوص نہیں ہوگا، تمام سیاسی ورکروں کی نگرانی کی جاتی ہے، آپ کی بھی کی جاتی ہوگی۔ اس میں گھبرانے اور پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ اپنا کام کرتے ہیں، آپ اپنا کام کیجیے۔ راہِ حق میں دشواریاں تو پیش آتی ہی ہیں''۔

جب میں استادؒ سے ملاقات کے لیے پٹنہ پہنچا تو برادرم سید وسیم اللہ صاحب کے یہاں قیام کیا تھا، جو ان دنوں سیکرٹیریٹ میں ملازم تھے اور کسی اونچے منصب پر فائز تھے۔ جماعت اسلامی سے ان کا تعلق 'ہمدردی' کا تھا لیکن اس تعلق کی بنا پر ان کے خلاف کارروائی چل رہی تھی۔ استاد محترم سے پہلے جو گورنر صاحب تھے، انھوں نے کوئی آرڈیننس جاری کیا تھا کہ جو سرکاری ملازم کسی سیاسی سرگرمیوں میں ملوث پایا جائے گا، اس کا compulsory retirement [جبری سبک دوشی] ہوسکتی ہے۔ اسی آرڈی ننس کے تحت وسیم اللہ صاحب کے خلاف کارروائی ہو رہی تھی۔ حالاں کہ اس آرڈی ننس کی مدت ختم ہو چکی تھی اور گورنر صاحب بھی تشریف لے جا چکے تھے۔ میں نے وسیم اللہ صاحب سے اس آرڈی ننس کا نام اور نمبر وغیرہ لے کر اسے استادؒ کی خدمت میں پیش کیا۔ انھوں نے چشمہ بدل کر بغور اس کو پڑھا اور پوچھا کہ ''اس طرح کے کتنے آدمیوں کے خلاف کارروائی ہوئی ہے''؟ میں نے عرض کیا: ''بہار میں تقریباً ۱۲۰ اشخاص کو جو جماعت اسلامی کے رکن تھے اور سرکاری ملازم بھی تھے، پرائمری سکول کے ٹیچر سے لے کر گزیٹیڈ آفیسر تک کو جماعت اسلامی کی رکنیت کے جرم میں برطرف کیا جا چکا ہے۔ ان لوگوں نے ملازمت سے برطرفی کو گوارا کیا اور جماعت سے تعلق کو برقرار رکھا۔ لیکنٗ وسیم اللہ صاحب جماعت کے رکن نہیں ہیں۔ ان پر جماعت کی رکنیت کا غلط الزام لگا کر ان کو پریشان کیا جا رہا ہے''۔ استادؒ نے اس پرزے کو رکھ لیا۔

ہماری یہ ملاقات بہت زیادہ طویل ہوگئی تھی اور ان کے پاس یاددہانی کی گھنٹی بار بار بجتی

رہی۔ جب ہماری گفتگو ختم ہوئی تو وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ مقررہ وقت سے زیادہ ہی وقت صرف ہو چکا ہے اور لوگ انتظار میں بیٹھے ہوں گے۔ باقی ان شاء اللہ آیندہ۔ اس طرح ان سے مصافحہ کر کے رخصت ہوا اور وہ دروازے تک پہنچا گئے۔

کچھ دنوں کے بعد جب وسیم اللہ صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ ان کے خلاف کارروائی ختم ہو چکی ہے اور ان کی ترقی کے ساتھ ان کی تنخواہ میں بھی اضافہ کیا گیا ہے اور میرے ساتھ جو سی آئی ڈی کی نگرانی تھی، وہ بھی ختم ہو گئی۔ دربھنگا میں سی آئی ڈی کے ایک افسر نے آکر اطلاع دی کہ ہمارے پاس آرڈر آگیا ہے کہ اب آپ کی نگرانی نہ کی جائے۔

● **تیسری اور آخری ملاقات:** جماعت اسلامی ہند نے مجھ کو ۱۹۶۲ء میں جماعت کی دعوت کے تعارف کے سلسلے میں آسام کا امیر حلقہ بنا کر گوہاٹی بھیجا۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۰ء تک میں گوہاٹی آسام میں رہا۔ ابتدا میں ۱۹۶۷ء میں جماعت اسلامی ہند کے اجتماع میں شرکت کے لیے مجھ کو دلی جانا تھا۔ میں نے استاد محترم کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا کہ میں دلی حاضر ہو رہا ہوں اور ان تاریخوں میں مرکز جماعت اسلامی میں مقیم رہوں گا۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں، اگر موقع ہو تو وقت مقرر فرما کر مرکز جماعت اسلامی کے پتے پر مجھے مطلع فرمائیں۔ اس کے جواب میں استادؒ کا جلد ہی ایک گرامی نامہ ملا جس میں درج تھا کہ ''جن تاریخوں میں آپ دلی رہیں گے، ان تاریخوں میں افسوس ہے کہ میں دلی میں نہ رہ سکوں گا۔ پہلے سے جنوب کا پروگرام بن چکا ہے۔ ان شاء اللہ جلد ملاقات ہوگی۔

اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد گوہاٹی میں استاد کے پرائیویٹ سیکرٹری اور ملٹری سیکرٹری کے خطوط ملے۔ جس میں درج تھا کہ استادؒ ۲۵/اپریل کو گوہاٹی پہنچ رہے ہیں۔ اس شام کو ساڑھے پانچ بجے سرکٹ ہاؤس میں مجھ سے مل کر وہ خوش ہوں گے۔ اس کے بعد دوسرے دن سی آئی ڈی کے ایک افسر میرے پاس آئے اور بتایا کہ پریسیڈنٹ ۲۵/اپریل کو گوہاٹی پہنچ رہے ہیں۔ ان کے پروگرام میں آپ سے ملاقات بھی شامل ہے۔ مہربانی کر کے سی آئی ڈی آفس آیئے، آپ کو ایک پاس دیا جائے گا۔ اس کو لے کر ہی آپ ان سے مل سکتے ہیں۔ چنانچہ میں سی آئی ڈی دفتر پہنچ گیا۔ سی آئی ڈی افسر نے مجھ سے پوچھا کہ صدر جمہوریہ ہند کس سلسلے میں آپ سے ملنا چاہتے ہیں اور ان کا آپ سے

کیا تعلق ہے؟ میں نے ان کو بتایا کہ وہ میرے استاد رہ چکے ہیں۔ میں نے جامعہ ملیہ میں تعلیم حاصل کی ہے۔ ۱۹۳۴ء سے ۱۹۴۰ء تک میں وہاں رہا۔ وہ ہمارے استاد بھی رہے اور وائس چانسلر بھی رہے۔ اسی تعلق سے اُن سے ملنا ہے۔ چنانچہ مجھ کو ایک پاس دیا گیا، اس کو لے کر میں ان سے ملا۔ میری ملاقات سے پہلے گوہاٹی کے ایک بڑے میدان میں ان کی تقریر تھی۔ پہلے میں جلسے میں شریک ہوا اور اُن کی تقریر سنی۔ اس کے بعد مقررہ وقت سے چند منٹ پہلے سرکٹ ہاؤس پہنچ گیا۔

مجھے ویٹنگ روم میں بٹھایا گیا۔ ان کے ملٹری سیکرٹری میرے پاس آئے اور بتایا کہ سب سے پہلے آپ کی ملاقات ہے اور آپ کی ملاقات کے لیے ۵ منٹ کا وقت دیا گیا ہے۔ جب آپ کی طلبی ہوگی تو میں آپ کو کمرۂ ملاقات میں پہنچا دوں گا اور کمرہ بند ہو جائے گا۔ جب آپ کا وقت ختم ہو جائے تو میں دروازہ کھول کر کھڑا ہو جاؤں گا تو مہربانی کر کے آپ اٹھ جایئے گا، ورنہ جب تک آپ بیٹھے رہیں گے، وہ بھی آپ سے باتیں کرتے رہیں گے اور آپ کے بعد آنے والوں کو موقع نہیں مل سکے گا۔ اس لیے کہ اس کے بعد نماز کا وقت ہو جائے گا اور وہ نماز پڑھیں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ ٹھیک ہے، مجھے کوئی عرض داشت نہیں پیش کرنی ہے اور نہ کوئی لمبی چوڑی گفتگو ہی کرنی ہے۔ ہم ایک دوسرے کی خیروعافیت دریافت کریں گے اور وقت ختم ہونے پر اُٹھ آئیں گے۔ ہماری یہ گفتگو ملٹری سیکرٹری سے ہو رہی تھی کہ استاذیؒ بی کے نہرو کے ساتھ، جو اس وقت آسام کے گورنر تھے، سامنے آئے اور اُن سے جدا ہو کر ملاقات کے کمرے میں گئے اور گھنٹی بجائی۔ مقررہ وقت سے پہلے ہی مجھے طلب کر لیا۔ میں اندر داخل ہوا اور سلام عرض کیا۔ وہ اٹھے، بڑھ کر گلے لگایا۔ خیریت دریافت کی اور پوچھا کہ ''آپ آسام کیسے آگئے؟'' میں نے عرض کیا کہ ''آپ تو جانتے ہیں کہ ہم لوگوں نے جماعت اسلامی ہند بنائی ہے اور کچھ لوگوں نے اپنی زندگیاں جماعتی سرگرمیوں کے لیے وقف کر دی ہیں۔ میں بھی اُن میں سے ایک ہوں۔ ۲۲ سالوں تک بہار، اڑیسہ، بنگال میں جماعت اسلامی ہند کی دعوت پیش کرتا رہا۔ اللہ کے فضل و کرم سے وہاں کچھ کارکن تیار ہو گئے تو اب جماعت نے مجھ کو آسام بھیجا ہے تاکہ یہاں بھی جماعت اسلامی کی دعوت پیش کروں۔ ساتھ ہی ساتھ آسامی زبان میں اسلامی لٹریچر تیار کرانے کا کام میرے سپرد ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ آسامی زبان میں اسلامی لٹریچر کی بڑی کمی ہے''۔

انھوں نے فرمایا کہ ''آپ نے بڑے استقلال سے کام کیا''۔ میں نے عرض کیا کہ محض اللہ کی توفیق اور آپ لوگوں کی تعلیم وتربیت ہے کہ اس کام کی سعادت حاصل ہوئی۔ آپ نے فرمایا کہ ''آسامی زبان میں اسلامی لٹریچر کے تیار کرنے کرانے کا کام بھی بہت اہم ہے''۔ انھوں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک سو روپے کا نوٹ نکال کر آسامی زبان میں اسلامی لٹریچر کے لیے دیا۔ میں نے قبول کرنے میں تامّل کیا کہ آپ سفر کی حالت میں ہیں، فوری طور پر دینا کیا ضروری ہے۔ انھوں نے میری جیب میں نوٹ ڈال دیا۔ اس کے بعد فرمایا کہ: ''پچھلے دنوں آپ نے محسن انسانیت بھیجی تھی، سیرت پر یہ کتاب مجھ کو بہت پسند آئی۔ سیرت پر میں نے بہت ساری کتابیں پڑھی ہیں، حتیٰ کہ مولانا شبلی کی سیرت النبیؐ بھی دیکھی ہے مگر محسن انسانیت مجھ کو بہت پسند آئی۔

اس کے بعد وہ خاموش ہوگئے۔ میں نے سوچا کہ اس مختصر ملاقات میں زیادہ تر انھی کے ارشادات سنوں گا اور اپنی طرف سے کوئی بات نہیں پوچھوں گا لیکن وہ خاموش ہوگئے تو میں نے عرض کی کہ آج جمعہ کا دن ہے، اگر گوہاٹی کی کسی مسجد میں جمعہ کی نماز بھی آپ کے پروگرام میں شامل ہوتی تو اچھا ہوتا۔ یہاں کے مسلمانوں کو توقع تھی کہ مسلمان صدر جمہوریہ ہند یہاں کی کسی مسجد میں نماز ادا کریں گے تو قریب سے انھیں دیکھنے کا موقع ملے گا۔ اس سلسلے میں گوہاٹی کے مسلمانوں کو مایوسی ہوگی۔

انھوں نے فرمایا کہ ''میرے دونوں گھٹنوں میں تکلیف رہتی ہے اور فرش پر نماز ادا کرنے میں تکلیف زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ میں چوکی پر بیٹھ کر پاؤں لٹکا کے نماز پڑھتا ہوں۔ کبھی کبھی عید، بقرعید کے موقعے پر دہلی کی عیدگاہ میں چلا جاتا ہوں تو بڑی تکلیف کے ساتھ نماز ادا کر پاتا ہوں''۔ میں نے عرض کیا: یہ عذر معقول ہے لیکن لوگوں کو اس کی خبر نہ ہوگی۔

اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ ''آپ کے جو بھی ہوم منسٹر ہوتے ہیں، جماعت اسلامی کے خلاف غلط الزامات لگایا کرتے ہیں اور ہم لوگ ان کی صفائی میں جو کچھ کہتے ہیں، ان کا وہ کوئی نوٹس نہیں لیتے۔ ایک طرح کے الزامات بار بار دہراتے رہتے ہیں''۔

انھوں نے فرمایا کہ ''وہ اپنا کام کرتے ہیں۔ آپ اپنا کام کیجیے۔ بات دراصل یہ ہے کہ آج کل سب لوگوں کو اور سب جماعتوں کو خوش رکھنے کے لیے اور توازن برقرار رکھنے کے لیے

سیاسی لوگ ایسی بات کہتے ہیں اور ایسی حرکتیں کرتے ہیں جو حقیقت اور صداقت کے خلاف ہوتی ہیں۔ پتا نہیں کہ خود چوہان جی کی (جو اس وقت ہوم منسٹر تھے) جماعت کے بارے میں اپنی راے کیا ہے۔ لیکن عام طور سے ایسا ہوتا ہے کہ الیکشن میں کامیابی کی خاطر لوگ ایسا کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے الیکشن کا موجودہ طریقہ غلط ہے"۔

اس موقعے پر میں نے عرض کیا کہ "تب تو الیکشن میں جماعت اسلامی کا حصّہ نہ لینا حق بجانب ہے"۔ اس کا انھوں نے خاموش مسکراہٹ سے جواب دیا۔ اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ بھارت میں فسادات کا سلسلہ آخر کب ختم ہوگا؟ میرے اس سوال پر وہ افسردہ ہوگئے اور کچھ دیر سکوت کے بعد فرمایا: "ہم لوگ مسلمان ہیں اور فسادات سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں، لہٰذا فسادات کو زیادہ محسوس کرتے ہیں، ورنہ حکومت کی کون سی کل سیدھی ہے؟ دیکھیے تلنگانہ میں کیا ہو رہا ہے؟ (اس وقت آندھرا پردیش میں تلنگانہ کی پُرتشدد تحریک زوروں پر تھی)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری لیڈرشپ بہت کمزور ہے"۔

یہ سن کر میں حیرت میں مبتلا ہوگیا کہ اپنی ہی حکومت کے سلسلے میں صدرجمہوریہ کیا فرما رہے ہیں۔ بات یہاں تک پہنچی تھی کہ صدر کے ملٹری سیکرٹری دروازہ کھول کر نمودار ہوئے اور میں ان کی ہدایت کے مطابق اُٹھ کھڑا ہوا۔ استادِمحترم بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں الوداعی سلام کر کے ہاتھ ملا کر دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ بھی میرے کاندھوں پُرشفقت سے ہاتھ رکھے ہوئے دروازے تک یہ کہتے ہوئے آئے: "اللہ آپ لوگوں کو کامیاب کرے، آپ لوگوں کی میرے دل میں بڑی قدر ہے"۔ اس آخری ملاقات کے بعد جب میں باہر نکلا تو میں بہت خوش اور مسرور تھا کہ انھوں نے میری سرگرمیوں کی تائید فرمائی اور دعا دی۔ ان کی حوصلہ افزائی اور دعائیں میرے کانوں میں گونجتی رہیں اور اب تک گونج رہی ہیں، مگر افسوس کہ میری خوشی اور مسرت کے لمحات بہت عارضی ثابت ہوئے۔

ایک ہفتہ بعد ۳ مئی ۱۹۶۹ء کو میرے ایک دوست نے آکر خبر دی کہ صدرجمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین انتقال کر گئے ہیں، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْن۔ یہ خبر سن کر میں اس درجہ متاثر ہوا کہ بستر پر جا کر لیٹ گیا اور دیر تک روتا رہا۔ جب کچھ سکون ملا تو وہاں سے اپنے ایک عزیز کے

یہاں چلا گیا جن کے پاس ریڈیو سیٹ تھا۔ بستر پر لیٹے لیٹے ،اس وقت تک ریڈیو سنتا رہا جب تک ان کی تجہیز و تکفین نہ ہوگئی۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے ـــــ آمین۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی زندگی ان دو حرفوں کی تفسیر تھی: ''با دوستاں تلطّف ، با دشمناں مدارا'' یا اقبالؒ کے اس مصرع کے مصداق تھے: ''مروت حسنِ عالم گیر ہے مردانِ غازی کا'' ـــــ یا اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے مطابق تھے: ''تم میں سے اچھا انسان وہ ہے جو اخلاق میں سب سے اچھا ہو۔ اور اللہ نے مجھ کو اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث فرمایا''۔ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ (الحجرات ۴۹:۱۳) ''تم میں سب سے محترم و مکرم بندہ وہ ہے جو سب سے زیادہ اللہ سے ڈر کر زندگی گزارنے والا پرہیز گار ہو''۔

نوٹ: ڈاکٹر ذاکر حسین برعظیم کی سیاست، دانش وَری اور تعلیم کے شعبوں میں ایک بڑا نام ہے۔ صدر جمہوریہ ہند کے منصب پر فائز ہو کر وہ ترقی اور عروج کی انتہا کو پہنچ گئے۔ برعظیم میں کوئی شخص، خصوصاً ایک بھارتی مسلمان، اس سے بڑے عہدے کا تصور نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کا سیاسی گراف تو بہت اُونچا چلا گیا مگر تعلیم (جو اُن کا اصل میدان تھا) یا دانش وَری کے بارے میں ان کی آدرشیں کیا ہوئیں؟
اُن کے قریبی رفیق اور دانش ور پروفیسر محمد مجیب نے ان کی سوانح عمری میں ان کی شخصی خوبیوں کے ساتھ ان کی مصلحت اندیشی کا ذکر بھی کیا ہے۔ علی گڑھ کے پروفیسر اور نامور ادبی شخصیت اسلوب احمد انصاری نے ذاکر صاحب کی وائس چانسلری کے زمانے میں انھیں قریب سے دیکھا۔ وہ لکھتے ہیں: ''حکمت عملی اور مصلحت اندیشی ان کی زندگی کے دو بنیادی تشکیلی اصول تھے۔ اس کا نتیجہ ہمیشہ مفاہمت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور کسی طرح کے تعہد (commitment) کی نفی کرتا ہے۔ مصلحت اندیشی، حق شناسی اور حق گوئی کے راستے میں، ان کے لیے عمر بھر زنجیر پا بنی رہی۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے انھوں نے بڑے قابلِ قدر کام کیے [مگر] بعض اوقات صاحبانِ جاہ و منصب کے زیر اثر اور ان کے دباؤ میں آکر نامنصفانہ طور پر اور جانب داری کے ساتھ ایسے لوگوں کو آگے بڑھایا جو اس اعزاز اور ترقی کے کسی طرح مستحق نہیں تھے۔ ذاکر صاحب کے ذہین اور فطین اور اعلیٰ فن کار ہونے میں کسی شک و شبہے کی گنجایش نہیں لیکن ان کا کوئی کارنامہ نہیں ہے''۔

ذاکر صاحب کی اس مثال سے یہ واضح ہے کہ انسان کی ذہانت و فطانت، اگر مصلحت کوشی کو راہ نما بنا لے تو حاصلِ حیات کیا ہوتا ہے۔ (مرتب)